

صُبح زنداں

حسن شہیر

طبع اوّل ـــــــــ نومبر ۵۳ء

اسرار کریمی پریس الہ آباد سے چھپکر پروین بکڈپو ۱۶/۹ یحیٰی پور الہ آباد ۳ سے شائع ہوئی

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو
نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

——— اقبال

فہرست

تعارف

شاعری ایک سنجیدہ ایک مہذب فن ہے۔ یہ صرف من کی موج نہیں، ذہن انسانی کا ایک زندۂ جاوید کارنامہ بھی ہے۔ کچھ لوگوں نے شاعری کو صرف کتاب دل کی تفسیر اور خواب جوانی کی تعبیر، سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ انسان کے خواب و خیال جوانی کے افسانہ وافسوں سے گزر کر زندگی کے گہرے حقائق کی توسیع و تنظیم کا بھی باعث بن سکتے ہیں مجھے غزل پسند ہے، مگر شاعری کے معنی غزلگوئی کے ہی سمجھنے کے میں خلاف ہوں۔ روایات کا میں احترام کرتا ہوں۔ روایات کی اہمیت کو سمجھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ انکے اچھے احساس کے بغیر شعر کی بساط پر گل کاریاں ناممکن ہیں۔ مگر وہ روایت پرستی جو ہر دور کی مجبوریوں کو بھی قانون کا درجہ دیدے۔ جس میں فن کے چھلکے پر فکر کے مغز کو قربان کردیا جائے۔ جس میں الفاظ کی حیثیت الہامات کی ہو جن میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔ میرے نزدیک بڑی نقصان دہ چیز ہے۔ مشرق یوں بھی قدامت پرست ہے اور ہندستان کو اپنی یہ مشرقیت کچھ اسطرح بھاگئی ہے کہ اسکا مزاج بن گئی ہے۔ ہماری اردو شاعری میں یوں تو نئے اور پرانے ہر قسم کے پھول ہیں۔ مگر پھر بھی مجموعی طور پر قدامت پرستی اب بھی غالب ہے، مانوس حسن کی پرستش اب بھی عام ہے۔ آباو اجداد کی تقلید کا جذبہ اب بھی بہت ہے، شرافت،

تہذیب، اخلاق کی طرح شاعری کی بھی ایک شریعت بن گئی ہے اور اس سے ذرا سا بھی انحراف کفر سمجھا جاتا ہے۔ کفر بھی ایمان کی رونق ہو سکتا ہے ابھی یہ نکتہ عام طور پر لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔

اُردو شاعری میں ایک تبدیلی وہ تھی جو آزاد و حالی سے شروع ہوئی۔ یہ شاعر کے زاویۂ فکر کی تبدیلی تھی۔ اسکے اثر سے حسن کا تصور وسیع ہوا اور شاعری کی کائنات بدل گئی۔ حالی جو تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور کی دولت سے بھی مالا مال تھے۔ خاموش تغیر اور مانوس تبدیلی کے قائل تھے۔ وہ نئے خیالات کو رفتہ رفتہ اور نامعلوم طور پر بڑھانا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے فن میں آسانیاں پیدا کیں، زبان کو وسیع کیا، مگر بنیادی طور پر کلاسیکل رمز و ایما ہی سے کام لیا۔ دوسری تبدیلی وہ تھی جسکے دھندلے نقوش شررؔ اور نظم طباطبائی کے تجربوں میں اور جسکی آب و تاب عظمت اللہ خاں کے وقیع کارناموں میں ملتی ہے۔ عظمت اللہ خاں نے مغربی تراجم۔ ہندی عروض اور گھریلو ماحول سے ایک نئی شعری عمارت تعمیر کی۔ انھوں نے پابند شاعری کو پہلا کھُلا ہوا چیلنج دیا۔ انھیں کے اثر سے فن میں تجربات کا سلسلہ شروع ہوا گیتوں کی مقبولیت، سانیٹ سے دل بستگی، بے قافیہ نظم کا استعمال۔ یہ سب باتیں عظمت اللہ خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔

ترقی پسند شاعری نے موضوعات پر زور دیا۔ اُسنے فن میں تجربات پر پابندی نہیں لگائی، مگر چونکہ ترقی پسندی میں خیالات کی اشاعت بنیادی اہمیت رکھتی ہے، اسلئے قدرتی طور پر وہ انفرادی کوششیں جو بقول شخصے 'خوش خاطر' وجود میں آئی تھیں یا جن میں شاعر کو اپنا دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا، اور اسے اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ پر کتنا بار پڑے گا۔ ترقی پسندی کے مسلک کے خلاف تھیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ سیاسی جدوجہد نے ذہنوں

کو اسقدر مقید کر رکھا تھا کہ لوگوں کو بانسری کی آواز یا چاندنی رات کی لطیف آنچ، یا حسن کی ساحری بھی ناگوار ہونے لگی تھی۔ اس وجہ سے فن میں تیسری اہم تبدیلی راشد، میراجی اور اختر الایمان کے ذریعے سے وجود میں آئی جو بعد میں خاصی عمومیت اختیار کر گئی۔

آزاد شاعری پر پرانے حلقوں میں اتنے سارے اعتراضات ایک سانس میں کیے جاتے ہیں، کہ وہ سب کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے۔ کہا جاتا ہے کہ جسکی صفائی سب سے زیادہ مضبوط ہو وہ ضرور مجرم ہوتا ہے، ورنہ بے گناہ آدمی تو بیان میں کچھ لغزشیں کر بھی جاتا ہے۔ اس طرح آزاد شاعری کے سر اتنے الزامات تھوپے گئے ہیں کہ وہ سب صحیح ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ چونکہ یہ مقررہ بحروں میں نہیں ہے اسلئے شعر نہیں ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب اتنی ساری پابند بحروں میں شعر کہے جا سکتے ہیں تو آزاد شعر کہنے کی ضرورت کیا ہے۔ کاش کولمبس سے کسی نے سوال کیا ہوتا کہ جب اتنے بہت سے جانے پہچانے بحری سفر موجود ہیں تو نئی دنیا کی تلاش میں جان جوکھوں میں ڈالنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ کولمبس کی دیوانگی، نئی دنیا کی دریافت کا باعث ہوئی، اور شعر و ادب میں جو دیوانے نئی راہیں نکالتے ہیں۔ اُنھیں کی مدد سے شاعری کی بساط دور تک پھیلتی ہے اور ویرانوں میں پھول کھلتے ہیں۔ آزاد شاعری پر ایک اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ یہ مبہم ہے اور اسکا جواب میں قدرے تفصیل سے دینا چاہتا ہوں۔

غالب کے وہ اشعار جو بیدل کے رنگ میں ہیں، اپنی نازک خیالی کی وجہ سے مبہم ہیں۔ مومن کی نازک خیالی میں محذوفات ہیں۔ غالب کا خیال نہ پیچیدہ ہوتا ہے نہ مشکل صرف انکی زبان پر عبور ضروری ہے۔ مومن کی زبان نسبتاً آسان ہے مگر انکے خیالات میں وضاحت کے بجائے نازک اشارات ہیں۔ ہر شاعر رمز و ایما سے کام لیتا ہے۔ رمز و ایما اگر پرانے ہو سکتے ہیں تو

نئے بھی قفس، آشیاں۔ زنداں۔ ساقی۔ مے کدہ۔ چمن۔ بہار۔ خزاں یہ سب مانوس علامات ہیں ایک ابہامیت وہ ہوتی ہے جو ایک کلاسیکی، مانوس اور جانے پہچانے رنگ کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ ہر دور میں اور ہر ملک میں ہوتی ہے۔ ایک ابہامیت وہ ہے جو رومانیت کی ایک شاخ ہے۔ یہاں رمز و ایما مانوس سانچوں کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ شاعر نے اپنے من مانے علامات برتے ہیں۔ فرانس میں اشاریت پرستوں کی تحریک۔ اسی دوسرے قسم کی تھی۔ یہ سرتاسر زوال آمادہ تحریک نہیں تھی۔ اس نے شاعری کو تازہ خون بھی دیا۔ ایڈمنڈ ولسن (Edmund Wilson) اور سی۔ ایم۔ بورا (C.M. Bowra) دونوں نے اسکی ادبی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ آئرلینڈ کا مشہور شاعر ڈبلو۔ بی۔ ایٹس (W.B. Yeats) تو ایک زمانے میں یہ پکار اٹھا تھا کہ اسوقت جو بھی معنی خیز بات ہو رہی ہے وہ سمندر پار (یعنی فرانس میں) ہو رہی ہے۔ غرض یہ کہ اگر یہ تحریک مریض انفرادیت جنسی کجروی اور ابلاغ سے مکمل بے پروائی اختیار نہ کر لیتی تو بھی اسکے اچھے اثرات زیادہ نمایاں ہوتے۔ اُردو میں راشد۔ میراجی۔ اخترالایمان کے یہاں یہ رجحان سب سے پہلے ایک واضح روپ میں ملتا ہے۔ تینوں کے یہاں ان ادبی تجربوں کی اہمیت ہے۔ تینوں شاعرانہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ راشد کی فکر پر اس کلبیت کی پرچھائیاں ہیں جو زندگی پر بے اعتمادی اور عقیدے کی کمی سے وجود میں آتی ہے۔ وہ طفلانہ ذہن یا زیادہ سے زیادہ آغاز بلوغت کا ذہن رکھتے ہیں جبھی تو انگریز عورت کے جسم سے وہ صدیوں کی غلامی کا انتقام لینے کی بات کرتے ہیں۔ میراجی کا گناہ اور مرض دونوں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ میراجی کے موضوعات پر غور کیجئے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ان موضوعات کو ستر پردوں میں لپیٹ کر ہی پیش کر سکتے تھے۔ انکے یہاں جنسی بے راہروی، جسم کی پکار، خواہش مرگ، یہ سب کچھ ہے، مگر انصاف یہ ہے کہ میراجی ایک شاعرانہ نظر رکھتا ہے۔ اُسنے جہاں اونچا

مکان، اور لبِ آبجو، جیسی نظمیں لکھی ہیں، وہاں 'کلرک کا نغمہ محبت، بھی لکھا ہے جو ہمیں ٹی ایس ایلیٹ کی نظم الفریڈ پروفراک کے نغمہ محبت کی یاد دلاتا ہے۔ راشد اور میراجی سے مانوس ہونے کے لئے اس دور کی تمام خصوصیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ یہ اچھی بھی ہیں اور بری بھی۔ مگران کے علم کے بغیر آپ اس دور کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔

چنانچہ آزاد نظم میں جو ابہام ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ شاعر یہاں یا تو من مانے علامات استعمال کرتا ہے یا وہ ایسے استعارے لانے کے لئے مجبور ہے جو اُسکے درد و کرب، اُسکی تلخی کام و دہن۔ اسکے خواب و خیال، اُسکی شکست و فتح کو بیان کرسکیں۔ وہ دیومالا سے مدد لیتا ہے۔ سائنس کی ایجادات پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اقتصادیات۔ قدیم تاریخ۔ ہوائی جہاز جوہری بم کو شاعری میں صرف کرتا ہے اور ہمارے وہ پڑھنے والے یا سننے والے جو صراحی دار گردن یا سینۂ شفاف یا زلفوں کی گھٹا یا مشرق کی غلامی تک پرواز کرسکتے ہیں۔ اس پرواز کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ شاعر سے ہمارا یہ مطالبہ ہونا چاہئے کہ وہ ایک عقیدہ رکھے۔ اُس عقیدے سے عشق اُسکے خونِ جگر کی بہاروں میں جھلک جائے۔ اُسکے پڑھنے سے ہمیں مسرت اور اس مسرت کے ساتھ تھوڑی سی بصیرت حاصل ہو۔ ہمارا احساس زیادہ رنگین، شنگرف کار اور روشن ہوجائے۔ مگر شاعر کا بھی ایک مطالبہ ہے جسے کم پڑھنے والے پورا کرتے ہیں۔ وہ مطالبہ یہ ہے کہ ہم شاعر کے یہاں صرف اپنی پسند کی چیز نہ ڈھونڈھیں بلکہ پہلے یہ دیکھیں کہ اُس نے یہ دکان کیوں لگائی ہے۔ گلاب کے پھول جو صدیوں کے ریاض کے بعد رنگ و بو کی جنّت ہوتے ہیں۔ کون نہیں پسند کرتا، مگر لالۂ صحرائی کے حسن کو نظر انداز کردینا، اربابِ نظر کا شیوہ نہیں۔

جدید شاعری میں لاکھ خرابیاں ہوں۔ مگر اُسکا ایک کارنامہ جو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، یہ کہ

اس نے حسن و عشق کے روائتی تصور کو بدل دیا ہے اور زندگی اور اُسکے نت نئے حقائق کی دلکشی اور عشق و مستی کی تخلیقی اور تعمیری عظمت کو شعر میں ڈھال دیا ہے۔ پرانا شاعر بڑے سادہ ذہن کا مالک تھا۔ جدید شاعر نے موجودہ دور کی پیچیدگی سے ایک تہہ دار اور پہلودار ذہن پایا ہے۔ اُسکے یہاں سیاسی غلامی۔ تہذیبی مسائل۔ حبشیوں پر مظالم۔ روس اور چین کی لالہ کاری جوہری بم کی ہلاکت آفرینی۔ طیاروں کی فضاؤں میں پرواز، نئے آلات حرب اور نئے آلات چارہ گری۔ سب نے مل جل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ کتنے خوابوں کی شکست نے اسے کلبی بنا دیا ہوتا۔ مگر وہ کلبی نہیں ہے۔ پیہم مایوسیوں کا نتیجہ قنوطیت کی شکل میں ظاہر ہوتا مگر کوئی جذبہ یا کوئی یقین اُسے اُبھارتا بھی ہے اسلئے اسکے یہاں قنوطیت بھی نہیں ہے وہ قوس قزح کے جھولے میں جھولنا تو چاہتا ہے مگر اُسے یہ بھی یاد آ جاتا ہے کہ اُڑان کی قیمت کیسے ادا ہوگی اور اگر بلندیوں سے گرونگا تو کیا کرونگا۔ وہ سستے نشے، سطحی خیالات کا فریب کھانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ محض پٹری پر آنکھیں بند کئے چلنا نہیں چاہتا۔ اُسے ہیرو پرستی نہیں آتی کیونکہ وہ ہر بڑے بت کے مٹی کے پاؤں دیکھ لیتا ہے۔ وہ مذہب و اخلاق کے رسمی تصور کو کافی نہیں سمجھتا۔ گویا اسکی شاعری ایک دھیمی دھیمی بہنے والی جوئے دل نشین نہیں ہے، ایک لمحہ سرخوشی کی یاد نہیں ہے، بلکہ اس دردمند روح کی فریاد ہے جو اس دور کے انسان کی ہیمان ہے۔ اس فریاد کی لے کو سمجھنا آسان نہیں۔ مگر اس میں ڈوب جایئے تو خود بخود خیال کی تہیں کی تہیں کھلتی جاتی ہیں اور شاید معنی بے حجاب سامنے ہوتا ہے۔

حسن شہیر کی صبح زنداں، ایسی ہی ایک دردمند روح کی فریاد ہے۔ اسکا درد چونکہ نیا ہے اور اس میں کتنی ہی جانی اور انجانی خلشیں اور ٹیسیں ملی ہوئی ہیں اور پھر اس میں عرفان و

آگہی کے کتنے ہی نئے پیمانے ملتے ہیں اسلئے اس کو سمجھنا آسان نہیں۔ مگر ان نظموں اور غزلوں کو سرسری طور پر پڑھنے کے بجائے غور سے پڑھا جائے اور بار بار پڑھا جائے اور اس بات کو تھوڑی دیر کے لئے نظرانداز کر دیا جائے کہ یہاں شاعری کے روایتی تصور سے کتنا انحراف ہے اور زبان کے ساتھ کتنی شوخی اور بے پروائی ملتی ہے تو اسکی حسن کاری کا ایک تعجب خیز احساس ہوتا ہے۔ شہیر ایک ذہین، درد مند اور حساس نوجوان ہیں اُنھوں نے فارسی، اُردو انگریزی کے ادبی سرمائے سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اُنکے ادبی ذوق کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرتے جہاں اُن کے ذہن کو جلا ہوتی اور اُنکی روح کو قدرے آسودگی ملتی۔ مگر حالات نے انھیں سرکاری ملازمت پر مجبور کر دیا جسمیں انفرادیت کو کچلنے اور لطیف جذبات کو پامال کرنے کی بے پناہ طاقت ہے ہندستان آزاد ہو گیا مگر ابھی تک ہمارا نظام حکومت ان روایات سے آزاد نہیں ہے جو بدیسی سامراج کی قائم کی ہوئی ہیں۔ سماجی نظام ابھی تک غیر منصفانہ ہے۔ معاشرت ابھی تک صحت مند اور آزاد ہونے کے بجائے قید و بند اور امراض کی شکار ہے۔ مذہبی تعصب۔ تنگ نظری۔ فرقہ واریت۔ صوبجاتی عصبیت ابھی تک عام ہے۔ تعلیم جو قدریں دیتی ہے، عام زندگی انھیں جھٹلاتی ہے۔ کوئی نسل اسطرح دو چکّی کے پاٹوں کے درمیان نہ آئی ہوگی جسطرح موجودہ نسل آئی ہے۔ شہیر کا بھی یہی حال ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی شاعری میں تلاش کی اور شاعری نے انھیں نہ صرف زندہ رہنے دیا بلکہ زندگی کا ولولہ بھی عطا کیا۔ انکے یہاں شاعری محض روزمرہ کی تلخ حقیقتوں سے ایک فرار نہیں ہے، یہ کیف جام شراب یا سنہرے خواب کا لمحہ شیریں نہیں ہے، بلکہ ایک سنجیدہ اور مہذب انسان کی روحانی اور ذہنی کاوش کا ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے۔ روشنی اور گرمی دونوں کا حامل۔

صبح زنداں میں نظمیں اور غزلیں زیادہ نہیں ہیں۔ مگر ان میں ایک انفرادی احساس۔ ایک لالہ کار طبیعت اور ایک خلاق ذہن کی کارفرمائی ملتی ہے۔ نظمیں زیادہ تر مختصر ہیں۔ پہلی نظر ہی میں یہ خیال ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ آزاد نظمیں ہیں بلکہ خواہ مخواہ مصرعوں کو توڑ توڑ کر لکھا گیا ہے اور بعض اوقات تو ایک ایک دو دو لفظ کی ایک سطر ملتی ہے۔ ڈی۔ ایم لارنس نے کہا ہے کہ آزاد نظم ایک لمحے کی ننگی تصویر ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ ہر سطر میں ایک ذہنی تصویر ملتی ہے جو پابند نظم میں مجروح ہو جاتی ہے۔ آزاد نظم کے پڑھنے کا آہنگ، پابند نظم کے پڑھنے سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہر سطر ذہن میں ایک اور پھلجھڑی روشن کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ نظم ختم ہوتے ہوتے عالم تخیل میں چراغاں ہو جاتا ہے اچھی آزاد نظم کہنا آسان نہیں ہے۔ یہاں ردیف قافیے یا مقررہ اوزان کی پابندی نہ سہی، مگر یہ پابندی ضروری ہے کہ کہیں سے زنجیر کی کوئی کڑی ڈھیلی نہ ہونے پائے، ہر تصویر یا ہر سطر جاذب نظر ہو۔ خیال اسطرح درجہ بدرجہ آگے بڑھتا جائے جیسے گویا سیڑھیاں طے کرتا ہوا بام پر پہنچ جاتا ہے اس تکنیک کو۔ شہیر نے خاص کامیابی سے برتا ہے۔ انکے یہاں ذرا سی ہڈی پر بہت سی کھال نہیں ہے۔ بلکہ اسکے برعکس انکا آبگینہ "تندی صہبا" سے پگھلا جاتا ہے۔

ہم لوگ اب تک شاعری میں دو اور دو چار والی بات ڈھونڈھتے ہیں۔ وہی دعویٰ اور دلیل۔ وہی مبتدا اور خبر، وہی لیلی کے ساتھ مجنوں کا ذکر، وہی چاند اور بادل، وہی حجاب اور بے حجابی، وہی صبح و شام اور بہار و خزاں۔ ہم ہر شعر میں ایک دو ٹوک بات چاہتے ہیں۔ بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ شاعری میں معنی سے زیادہ کیفیات ہوتی ہیں۔ اگر آپ اس کیفیت تک پہنچ جائیں تو معنی خود بخود روشن ہو جائیں گے۔ جدید مغربی شاعری میں ایک خوش گوار ابہام جا بجا ملتا ہے۔ جہاں ذہن ایک معنوی دھندلکے میں رقص کرتا ہے،

یہاں شاعر بیک وقت کئی باتیں کرتا ہے۔ وہ مصوّری اور مفکری۔ تعارف اور تشریح، تنقید اور اصلاح۔ پیمبری اور شیطنت سب کے فرائض انجام دیتا ہے۔ یہ کیفیت مجھے شہیر کی متعدد نظموں میں نظر آئی۔ جدّت کے ساتھ یہاں لذّت بھی ہے۔

شہیر کے فکر و فن پر نظر ڈالنے سے پہلے انکی ایک نظم کا تعارف ضروری سمجھتا ہوں تاکہ فکر و فن کے متعلق میری رائے ہوائی نہ معلوم ہو۔ تجدید کے شروع میں کہتے ہیں۔

کون جانے تری تقدیر کے پائندہ نقوش ——
تیری قسمت کا جمود اور سکوت
اُسی تاریک گزرگاہ کی منّت کش ہو
وہی تاریک گزرگہ کہ جو اک رات کا سرمایہ ہے

آخری بند ہے ؎

ایک بار اور مرے ذہن کے پردوں کی لکیریں جاگیں
ایک بار اور مری خام نگاہی کے اُلٹ جائیں نقاب
اور خاکستر ماضی کے یہ محراب اور طاق
ذہن تخ بستہ کے تاریک کھنڈروں میں
جگمگا دیں مری عظمت کے صنم خانوں کو

اس نظم میں ایک پیمان کی تجدید ہے۔ یہ پیمان نئی زندگی سے اور روشن مستقبل سے ہے۔ یہ زندگی کا رجز ہے۔ اس میں درد و کرب کے باوجود ایک فاتحانہ عزم ہے۔ یہی پہلو ہے جسکی وجہ سے شہیر کی آزاد شاعری میرا جی، راشد اور اختر الایمان کی منفی شاعری کے مقابلے میں اثباتی پہلو رکھتی ہے۔ یہ شاعر زندگی کے زخم کھانے

کے باوجود زندگی پر مسکرا سکتا ہے اور ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھ سکتا ہے۔ اِس خواب میں تہذیب و تمدن کی کتنی حقیقتیں جگمگا رہی ہیں۔

آہٹ میں کہتے ہیں ؎

مری تمنا بدوش نظروں کو ایک بار آج پھر حقیقت کے
رُخ کا سنگیں نقاب اُلٹ دینے دو
کہ یہ شام، یہ سحر، یہ حسین دھندلکے
جماہیاں لیں گے عہد نو کی
جماہیاں لیں گے عہد نو کے گرج کی تپ کی
جماہیاں لیں گے عہد نو کے گرجتے، تپتے، بپھرتے سورج
کی دھوپ میں
کہکشاں کے، تاروں کے رُوپ میں
آبنوسی چشموں میں
گھومتے ناچتے شراروں میں
سنگ و آہن کی چوٹ پر
بادلوں میں طوفاں میں بجلیوں میں

'آزادی کے بعد' میں کہتے ہیں۔

یک نفس اور ٹھہرو ذرا
خواب گہ کو
تو ویران

مت چھوڑ جاؤ
مرے دل کے بیدار نغمو
مجھیں اپنے
ذلّت کے سر کی قسم
اک ذرا سا توقف
کہ یہ برگزیدہ
نظر منتظر ہے
ابھی تو اُس اک حرف زندہ نفس کی
جو برسے گا دشمن پہ فولاد بن کر

شہیر کی نظموں میں مجھے "شارعِ امید" اور "نیا سویرا" خاص طور پر پسند آئیں۔ ان نظموں کو پورا پورا نقل کرنے کی یہاں ضرورت نہیں، پھر بھی "نیا سویرا" کا پہلا بند دیکھئے ؎

عجم کی
شیرازہ بندیوں کے
یہ خونچکاں
بام و در
نگہ کی
سحر
قریبِ نشانِ منزل

شاعر اُمید کا ایک ٹکڑا دیکھئے ؂

وہ لمحہ ....

— جلوت وخلوت کے

ہنگامِ طرب سے دور —

افسردہ شکستہ

وقت کے کندھوں پہ — وہ اُڑتی ہوئی

ایک رات کی دوشیزۂ عنبر فشاں

زلفوں کو لہرائے ہوئے

گردوں کی بے پایاں گراں خوابی پہ

وحشت کا نزولِ بے کراں

کھلتا ہوا درِ بامِ زنداں کا

اقتباسات کافی ہو چکے۔ جو شخص بھی ذرا سی سوجھ بوجھ رکھتا ہے وہ یہ سمجھ لے گا کہ شہیر کی نظموں کے تمامتر موضوعات سیاسی ہیں۔ شہیر کے یہاں سیاست جلسے اور جلوس کی ہنگامہ آرائی اور نعروں اور انتخابات کی بازیگری نہیں، تہذیب اور تاریخ کے مجموعی شعور کی آواز ہے۔ شہیر پہلے شاعر ہیں جو اس رمز و ایما میں سُرخ انقلاب کی نوید سناتے ہیں۔ وہ آزاد نظم کے دھندلکے میں سماجی انصاف کی چاندنی کا پیام لے کر آئے ہیں۔

شہیر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ لالہ کارِ تخیّل رکھتے ہیں اور کئی خیالات کو

ساتھ ساتھ لئے چلتے ہیں۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے مگر مجموعی طور پر اسکی وجہ سے نظم کی گہرائی بڑھ جاتی ہے اور شاید اسکی اپیل بھی گہری ہو جاتی ہے۔

شہیر نے مروجہ زبان اور قواعد سے خاص بے نیازی برتی ہے۔ یوں دیکھئے تو اُن کے یہاں بہت سی فنی غلطیاں ملتی ہیں۔ مگر دراصل یہاں ایک نئی راہ نکالنے کی کوشش ایک نئے شعور کی جلوہ گری کا عزم اور ایک نئے احساس کی ترجمانی کی سعی ملتی ہے۔

یہی بات اُنکی غزلوں میں نمایاں ہے۔ غزلوں میں بھی حکایت غم جاناں اور غم دوراں عام رنگ میں نہیں ہے۔ بحروں میں بھی تازگی کے ساتھ تھرتھراہٹ اور زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ چند اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

اب آسماں کی حقیقت تمام زنداں ہے — یہ اعتماد بیک جنبش نظر تو نہیں
میں اپنی زیست کی تابندہ رہگزاروں میں — کچھ اسقدر غم رفتہ سے بے خبر تو نہیں

رنگ چڑھنے دے آبگینوں پر — یہ نگہ آفتاب پر ہوگی
دیکھ افسردہ گام منزل بھی — کتنی صدیوں کی رہگزر ہوگی

وہ ذکر یار ہو یا مہر و ماہ کی دھڑکن — فسردہ کر ہی گئے کچھ فسانہ ہائے کہن

ابھی تو صبح حقیقت تمام زنداں ہے — شہیر رات کی پلکیں ہنوز ہیں بھاری

جل بجھی اک شمع بے رنگ اور اگر اے دل تو کیا — ضربتِ فولاد آدم صد ہزار آنکھوں میں ہے

دھرتی کی چھاتی پر چل کر کتنے تازہ دم نکلے
آبادی سے ہو کر گذرے کتنے غمگیں ہم نکلے

میں گزر جاؤں بھی تو کیا ہوگا مرحلہ طے جنوں کی منزل کا

یہ دوش کی ظلمت ہے وہ فردا کے دھندلکے آ زندگی و موت کی سرحد سے نکل کے

تعارف کو داستاں دراز نہ ہونا چاہئے۔ اسی سے میں اب ان سطروں کو ختم کرتا ہوں صبح زنداں میں ایک جدید اور لذیذ رنگ ہے۔ یہ ایک ایسے شاعر کا کلام ہے جو ترقی پسند نقطۂ نظر رکھتے ہوئے اور سماجی اور اجتماعی حقائق کو مانتے ہوئے، اپنی انفرادی نظر اور انوکھے احساس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس میں اسکی تازگی اور زندگی ہے۔ شہیر کا کلام مشاعروں اور جلسوں میں پڑھے جانے کا نہیں ہے۔ یہ خلوت کا چراغ ہے اس میں گہری فکر کے ساتھ خون جگر کی رنگینی ملتی ہے۔ اس میں مروجہ فن سے بغاوت کسی فیشن کی تقلید میں یا محض اپنے کو نمایاں کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اپنے دور کے ہمہ رنگ شعور کو پانے کیلئے ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسکا ہمارے ادبی حلقوں میں خیر مقدم کیا جائے گا۔ شہیر نے آزاد شاعری کو ترقی پسند بنایا ہے۔ یہی انکا کارنامہ اور یہی ان کی فضیلت ہے۔

آل احمد سرور

۲۷۔ مئی
نعمت اللہ روڈ
لکھنؤ

اعتراف

اجتہاد مروجہ اور روائتی فن کی تفریح بخش تقلید سے ممکن نہیں۔ جذب واثر خواب آور اور لوری دینے والے گیتوں میں ڈھل جائیں تو خوش کن ضرور ہیں۔ زندگی کو مگران سے کوئی بھی واسطہ نہیں۔

میں نے اپنے فکری رجحان کے مطابق وقت کی بدلتی ہوئی آواز کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی خواہش میں اپنے ذہنی اُفق پر ایک نئے احساس اور شعور کی افزائش کی شمع روشن کرنے کی سعی کی ہے۔ اس نئی ڈگر پر چل کر شروع میں آپ کو اجنبیت کا احساس ہو ہوگا جس سے رفتہ رفتہ کچھ غور و فکر کے بعد آپ مانوس بھی ہو سکتے ہیں۔ شاید آپ کو اس انحراف میں زندگی کے نئے امکانات کی جھلک بھی نظر آئے۔

یوں بھی میرا ذاتی خیال ہے (غلط یا صحیح) کہ کسی تخیل کو روائتی اور سکہ بند الفاظ کا جامہ پہنا دینا کوئی خاطر خواہ دیدہ زیبی کا باعث نہیں ہوا کرتا۔ منفرد رنگوں کا امتزاج مختلف خاکوں کے لئے بہت ضروری ہے۔ رنگ، ظاہر ہے کہ شاعر کے مزاج اور اُسکے ماحول کے مطابق نہ ہوں تو خاکوں میں کسی قسم کی جاذبیت کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے قدیم اور روائتی رنگوں کی آویزش سے قطعی احتراز کیا ہے۔ لیکن اس بات کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ جو مرقع انکی مختلف ملاوٹ سے پیدا ہو وہ اس دور کی مختلف کیفیتوں کا پیش رو ہو۔

ابتک جو تاریخ ہمارے آباو اجداد کے کارناموں کی مرتب ہو چکی ہے اس سے مجموعی طور پر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اُن کی زیادہ تعداد ہر دور میں ظلم، تشدد اور لاعلمی کے تیرو تار رہگزاروں پر گامزن رہی ہے۔ اگلے زمانے میں یا تو کسی جابر فرمانروا نے یا فی زمانہ چند سربرآوردہ دولت مند افراد نے انسان کی قسمت کے فرمان پر مہریں ثبت کی ہیں۔ یہ فیصلے غیر مساویانہ اور غیر دیانت دارانہ نظریۂ حیات کے آئینہ دار رہے ہیں۔ ہماری ساری بنیادی قدریں، نظم و نسق، تمدن، فلسفہ، مذہب، تاریخ اور سارے کا سارا سماجی بندوبست کسی نہ کسی خود غرضی کی بنا پر وجود میں آیا ہے۔ اب یہ ادارے اس دور کی خصوصیات اور سائنٹفک نظریات کے سامنے اپنی ساری مصنوعی چمک دمک کھو چکے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے روائتی طرز نگارش سے نفسیاتی ردعمل کے زیر اثر قطعی بے اعتنائی برتی ہے اور انسانی آواز کی اُن قدروں کے آہنگ سے روشناس ہونے کی آرزو کی ہے جو ہمہ گیر انسانیت اور خیر و برکت کے بے اندازہ جذبہ کا سرچشمہ ہے۔

میں کامیابی اور ناکامیابی کو زندگی کے بنیادی حقائق کے زیر اثر کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ یہ مگر ضروری ہے کہ ہر شخص کو اس سے وابستگی کا خراج اپنی جگہ پر نہایت خلوص اور دیانت داری سے ادا کرنا چاہیئے۔ یہی انسانی حیات کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

منزل کو متعین کرنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ اسکی داخلی اور خارجی ہیئت میں کوئی بنیادی فرق نہ پڑ جائے۔ اسی واسطے شاید میں نے اپنے طرز بیان میں ہر جگہ گنجائشیں رکھی ہیں جو نفی سے تو نہیں لیکن مثبت سے ضرور پوری ہو سکتی ہیں۔

انسان ہمیشہ آگے بڑھتا رہا ہے۔ اور اس کی بیشتر مشکلات کا حل اسکی مسلسل جدوجہد کا آئینہ دار ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہماری منزل بتدریج آگے بڑھتی ہے اور اسکی واضح عکاسی ہمارا فرض ہے۔ یہ مگر اُسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم آنے والی منزل کی صرف ایک ہی کڑی پر نظر رکھ سکتے ہوں اور اس کے آگے کچھ نہ سجھائی دے۔

مجموعی طور پر مجھے اس آنے والی منزل کی پہلی کڑی کا احساس ہے اور شاید وہ دن بہت دور نہیں جب ہم اس تک پہنچ کر ہی دم لیں۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ ہمارا قافلہ وہیں پر تھک کر بیٹھ جائے گا —— یہ تو شاید غیر ممکن ہے۔

اس احساس اور زندگی کے مختلف محرکات کو میں نے جس انداز میں پیش کیا ہے اس پر کچھ ہلکی سی روشنی ڈال دینا یوں مناسب سمجھا کہ عام طور پر اس نوعیت کی منظومات ظاہرہ غلط فہمی کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔ میں کہاں تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکا ہوں یہ میں خود نہیں کہہ سکتا۔ شاید اسکا تجزیہ اہل نظر بہتر زاویے سے کر سکیں۔

حسن شہیر

سنگِ میل

تو مرے پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
میری افسردہ نگہ کا خطِ تحریر نہ دیکھ
لمحۂ فکر کوئی اور سہی
کروٹیں رُوح کو اس وقت بدل لینے دے

اے مری جان — مری شمعِ شبستانِ حیات
تو بہ ہر لحظہ مرے دل کی ہے مدّھم سی پکار —
اک سلگتی ہوئی خاموش نوا
ڈھونڈھتی پھرتی تھی مدّت سے جسے میری نگاہ

آج اُس لمحۂ جاوید کو پھر پا ہی گیا
آج اک ساغرِ زہراب کو چھلکا ہی گیا

مشرق کا خدا

سُست پڑ جائے گی کچھ دم میں ابھی نبضِ حیات
اور گردوں پہ ستارے بھی نہ رہ جائیں گے
زیست اِک اور نئی دُھن میں غزل گائے گی
کارواں موت کی سرحد سے گزر جائے گا
تند موجوں کے تھپیڑوں پہ زمیں کانپے گی
اور تھراتے ہوئے وقت کے خونیں شہپر
دوشِ امروز پہ فردا کی خبر لائیں گے

کون کہتا ہے کہ مشرق کا خدا کوئی نہیں؟

کس کی پُرکاریٔ فطرت ہے نوا سے محروم؟
کون افرنگ کی دہلیز پہ ہے سر بہ سجود؟
کس کے سجدوں کے جہنّم کو ہے جنّت کا گماں؟

فاش کر دوں گا کوئی دم میں ابھی رمزِ حیات
اور دکھلا بھی تجھے دوں گا کہ مشرق کا خدا
کس طرح موت کی وادی میں قدم دھرتا ہے

موت

ہم زمانے کی نگاہوں سے بہت دور رہیں
—— لیکن پھر بھی
ہم زمانے کی نگاہوں میں پھرا کرتے ہیں
تشنۂ کام و دہن رہ کے بھی کچھ کہہ نہ سکیں
ایسی خود دار نگاہیں بھی کہیں دیکھی ہیں

موت اک گزرے ہوئے خواب کی تعبیر کا نام
اشک اور خون سے لبریز ہیں مینا و ایاغ
آج اک جام کی سنگین حقیقت میں نہاں
کتنے احساس کے دوزخ کے سُلگتے ہوئے انگارے ہیں

میں نے سوچا تھا کہ اب حرف نہ لاؤں گا زباں پر — لیکن
رُوکنے سے کہیں رُکتا ہے یہ سیلابِ عظیم
میری گمراہ کن آواز دوراہے پہ بھٹکتی ہی رہی —
سنگِ بنیادِ قفس ٹوٹ کے کاندھے پہ گرا
اور — پھر گھومتے خورشید کے چکّر کا خیال
یک بیک ذہن کے تاریک جہنّم کو بھی چمکاتا ہوا
خواب کو خواب سے چونکاتا ہوا — آ ہی گیا

سنگِ بنیادِ قفس ٹوٹ کے کاندھے پہ گرا

آزادی

آخرِ شب ——

وہ خون کی ندّیاں ——

وہ —— جیسے کہ موت کی بے پناہ ظلمت میں زندگی کے

چراغ روشن ہوں

—— انجمن جگمگائے آئے

سنہرے خوابوں کی

مرمریں چادروں میں لپٹے ہوئے اندھیرے

وہ خون کی ندّیاں ——

وہ جیسے کہ رقص کرتی ہو چاندنی میں کوئی حسینہ

طلوع ——

یہ نغمۂ صبحِ نو ہے

—— یا جلترنگ پلکوں پہ شب کے جلتے ہوئے ستاروں کی روشنی

—— یا گرجتی صدیوں کی آہٹیں

—— یا اُٹھا وہ محور پہ نوکِ مژگاں کے کوئی نغمہ

سفید پائل کی بول پر

[تالیاں بجاؤ]

گمان پھر ہو چلا ہے خود مجھ کو اپنے غم کی مفارقت کا

غبارِ خاطر کے شبنمی آنسوؤں میں بھیگے ہوئے اندھیرو —— !

تجدید

کون جانے تری تقدیر کے پائندہ نقوش ـــــــــــ
تیری قسمت کا جمود اور سکوت
اُسی تاریک گزرگاہ کی منّت کش ہو
وہی تاریک گزرگہہ کہ جو اک رات کا سرمایہ ہے

کون جانے تری نمناک نگاہوں کا سکوں ـــــــــــ
خود تراشیدہ بتانان جہنّم کا فسوں
ایک ساغر کے چھلک جانے کا خمیازہ ہو

آج میں کاہکشانِ غم واندوہ کی اِس راہگزر سے بھی پرے

سیکڑوں سال کی محبوس تمنّاؤں کا ہیجان اُٹھائے
اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہوں
روندتا جاتا ہوں اجداد کے قدموں کے نشاں
جن کے ہر موڑ پہ جبر اور تشدّد کے ستوں
حسرت و یاس کی نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں

تیرے مہوش کدۂ غم پہ بھی پڑتی ہے نگاہ
ہاں — مگر اک نئے آفاق کا عُنوان لئے

آج میں غم کدۂ فرد کے زنداں سے بھی دور
خون کرنے کو خود اپنی ہی تمنّاؤں کا
دل کے جلتے ہوئے شعلوں کو ہوا دیتا ہوں

آج جیسے مرے احساس کے زندانوں کو
سم میں ڈوبی ہوئی ہر سانس جلا ڈالے گی
اور جیسے کہ یہ افکار کے کوندوں کی لپک

اک نئے باب کی پایندہ بنا ڈالے گی

ایک بار اور مرے ذہن کے پردوں کی لکیریں جاگیں
ایک بار اور مری خام نگاہی کے اُلٹ جائیں نقاب
اور خاکستر ماضی کے یہ محراب اور طاق
ذہنِ تخ بستہ کے تاریک کہستانوں میں
جگمگا دیں مری عظمت کے صنم خانوں کو

آہٹ

مری تمنا بدوش نظروں کو ایک بار آج پھر حقیقت کے
رُخ کا سنگیں نقاب اُلٹ دینے دو
کہ یہ شام، یہ سحر، یہ حسیں دھندلکے
جماہیاں لیں گے عہد نو کی،
جماہیاں لیں گے عہد نو کے گرج کی تپ کی،
جماہیاں لیں گے عہد نو کے گرجتے، تپتے، بپھرتے سورج
کی دھوپ میں،
کہکشاں کے، تاروں کے روپ میں،
آبنوسی چشموں میں،
گھومتے، ناچتے شراروں میں،

سنگ و آہن کی چوٹ پہ،
بادلوں میں، طوفاں میں، بجلیوں میں۔

گرجتے، تپتے، بپھرتے سورج کو کس نے دیکھا ہے خون
کرتے ہوئے شبستانِ غم کی چوکھٹ پہ
قہقہہ بار آنسوؤں کا ——— ؟

شہابِ ثاقب کے گرد لاکھوں چراغ زنداں کے رقص کرتے
ہوئے چلے آ رہے ہیں ——— لیکن ——— !
یہ کون ہے ——— ؟
کس کی آہٹوں پہ ہر ایک شمع بجھی چلی جا رہی ہے ——— جیسے
کوئی دبے پاؤں آ رہا ہو ہزار ہا مشعلیں جلائے ہوئے
نگاہوں کی سلوٹوں میں

قدم قدم پر چٹکتی کلیوں کی شوخ رنگت نکھر رہی ہے
بکھر رہے ہیں وہ شب کے گیسو
مہکتے پھولوں کی گرم خوشبو تو اک فسانہ ہے بادلوں کا

جو گھر کے، منڈلا کے آسمانوں کی وسعتوں سے برس چکے ہیں

مہکتے پھولوں کی شوخ رنگت نکھر چکی ہے
بکھر چکی ہے

برس چکے ہیں
یہ بادل اشکوں کے
آسمانوں کی وسعتوں سے

قدم قدم پر چٹکتی کلیوں کی شوخ رنگت ـــــــ
مہکتے پھولوں کی گرم خوشبو!
یہ گرم خوشبو، یہ شوخ رنگت
مرے شبستانِ غم پہ بھی بارہا مہ و آفتاب بن کر
چمک چکے ہیں
دمک چکے ہیں تمھارے عارض کی سلوٹوں پہ
مری تمناؤں کے حسین پھول ـــــــ
جھلملاتے ہوئے شرارے

مگر یہ پھر کون آرہا ہے
ہزارہا مشعلیں جلائے ہوئے نگاہوں کی سلوٹوں میں

خیال ہوتا ہے سنگ و آہن کے خونچکاں ساز بھی نہ تڑپا سکینگے شاید
مری تمناؤں کے کھنڈر کو

یہ دل کی ویران بستیاں کیا یونہی خیال آفریں تصوّر کے رنگ
محلوں میں
سانس لیتی رہیں گی ہر دم — ؟

— وہ دور مشرق کی وادیوں میں
نہ جانے کتنے ہی ایسے نغموں کی گونج ٹکرا رہی ہر پربت کی چوٹیوں سے
شکستہ مبہم نقوش
جانے، نہ جانے کتنے ہی ایسے مبہم نقوش — اُلجھے ہوئے فسانے
تری نگہ کے، مری نگہ کے
سمندر اور آسماں کی گہرائیوں میں کھو کر بھٹک چکے ہیں

پاداش

یہ فردوسِ نظر شہکار
اک حسنِ مجسّم کا-----

قیامت ہے
کہ خندق کھودتا ہوں میں
بساطِ ذہنِ بے مایہ کی اِن سنگیں فصیلوں پہ
کہ مل جائے کوئی حیلہ
مرے بھی دست و بازو کو
جنوں کی آزمائش کا

وہ خواب آگیں صُراحی
جس کے حلقوں میں
گرُسنہ شب برہنہ رقص کرتی ہے
مری جنّت کے محرابی ستوں سے یوں گرُیزاں ہے
کہ جیسے آگ سے پانی
سمندر جیسے دیوآسا پہاڑوں سے

کبھی یہ سُوچتا ہوں ——
زندگی پامال کرڈالوں
جہنّم کے سفینے کھول دُوں طُوفاں کی موجوں پہ
کبھی یہ سُوچتا ہوں
کھینچ لوں تلوار آہن کی
تخیُّل کے ربابوں پر
کچُل ڈالوں زمینِ خُلد کے اُن آبگینوں کو
جو کتراتے رہے میرے
خیابانِ تصوّر کی
گرُسنہ آرزوُں سے

یہ فردوسِ نظر شہکار
اک حسنِ مجسّم کا
ابھی تک وجہ کاوش ہائے داغِ سوزِ پنہاں ہے

اس اک کاوش میں کتنی بے بسی کا راز مضمر ہے

زہر خند

—— یہ قفس کے بام و در

یہ جاگتی راتیں
سُلگتی شاہراہ
وہ —— ان افسُردہ گزرگاہوں کے آگے
جگمگاتی خلد گاہ

[تیرے ارمانوں کی جنّت]
سیمبر نغموں کا رقص و رنگِ ناپیدا کنار
حملۂ زندانیٔ گیتی سے کتنی دور ہے

ایک مبُہم آسیا کا رقص بے معنیٰ ہوں میں

سوچتا ہوں کہ تمدن کا یہ بوڑھا دیوتا
کب تک آخر رقص فرماتا رہے گا
اُن پُرانی عظمتوں کا
جن کی بنیادوں پہ رکھّا تھا مرے اجداد نے
کشورِ بابِ حیات ——؟

مضطرب رکھے گی کب تک
میرے دل کو
آرزوئے ناصبور ——؟
جس کی دُھن پر
آج بھی اے قوّت و جبروت کے پروردگار
رقص کرتی ہے یہ تیری کائنات

کب تک انساں کا یہ درد و غم رہے گا
وجہِ سامان نشاطِ بزمِ امکانِ حیات؟

شائد آخر کو مری یہ کم نگاہی

دور رس نظروں سے دیکھے

میں تو خود اپنی نگہ کے دائرے سے دیکھتا ہوں
سنگِ بنیادِ قفس کا زہرخند

وقت کا سفر

آج اے دوست کئی قافلۂ وقت کے تاریک رباب
بج رہے ہیں جو مرے ذہن کے ایوانوں میں
[فاصلہ دیکھ تو اِن اُجڑی ہوئی صدیوں کا]
کتنے ہی گونجوں کے پردوں میں چھپائے ہوئے منزل کے نشاں
ایک مرکز پہ کچھ اس طرح سمٹ آئے ہیں
جیسے پھیلے ہوئے آکاش پہ سورج کی شعاعوں کا ہو آغازِ سفر

ایک منزل تری اُن اُجڑے دیاروں کی بھی تھی
جن کی خاکسترِ پنہاں میں ابھی تک ہیں وہ جلتے ہوئے مدھم سے دیے
جل بجھے جن میں ہزاروں گُل و نسرین و ایاغ

ہم سفر آج کئی رات کی تنہائی کے بعد
قرمزی رنگ ستاروں کے اُن انگاروں پر
جن کے جلتے ہوئے شعلوں میں تمدّن کا دھواں
گھُٹ کے آ ما جگہ کام و دہن بن نہ سکا

اظہار تشکّر [ایک طنز]

[ا]

وہی شاہراہیں جو کترا کے نکلیں تھیں
سنگیں چٹانوں سے
ٹھوکر لگی ——
اور —— اک پل میں لاکھوں دیے ٹمٹمانے لگے
موت کے بے پنہ ساز کی آہٹوں پہ

سکندر رہے اپنے مقدّر کا وہ شخص
جواب انھیں شاہراہوں کی سنگیں چٹانوں پہ سر رکھ کے سو جائے
لعنت گری آسمانوں وزمیں کی
جبیں سائی کرنے کو مجبور ہو جائے زنداں کے در پہ

جو پتھر بھی پگھلے تو آہن نہیں بن سکے گا
خداوند آدم کی دریوزہ گر زرگری کا

[۲]

مشیّت کی قربان گاہوں پہ صدیوں کا دم گھُٹ چکا تھا
کہ اک لہر اٹھّی مرے دل کے ساگر میں
بربط کے تاروں پہ
گھُومی حیات
آگ اور خون کے بے پنہ سُرخ نتھنوں کو پھیلائے

پروردگار آج کا کل نہ ہوگا ـــــ

یہ بربط ـــــ یہ نغمہ ـ
یہ اندوہگیں ساز ـــــ مضراب
یہ راگ ـــــ یہ رنگ ـ

حیران ہوں کہ تری کُل حقیقت کا بارِ گراں کیا اُٹھا بھی سکوں گا ـــ؟

آزادی کے بعد

بہت دُور ——
مشرق کی
اُن وادیوں میں
جہاں
تیرے رحم و کرم کا
سزاوار
انسان
—— پتّھر کا بُت
آہنی خواب زاروں کا دُھوکا
شکنجوں سے

چھُٹ کر
اُٹھا تھا
کہ اِک حرفِ گُستاخ
شعلہ نفس ہو کر اُٹھّا

دھڑکتے ہوئے
کوچہ و بام سے
گرد اُڑی
گُرز اُٹھے
شادیانے بجے

حرفِ گُستاخ
اک بار
پھر آج
دوزخ کے
محراب و در
کھول دے

انتقام

آگ — کوندے — لپک — گونج
مسمار کر کے نہ رکھ دے

اب اسے
شعلۂ سازِ محکم
یہ مانگے کے
دشت اور کہسار
یہ خُوب اور زِشت کی
عافیت گاہ

تہذیب کا دیوتا

اپنے جبڑوں کو
کھولے ہوئے
شعلہ زن ہے
جواں رات
صدہا شکستوں کے بعد
آج پھر جاگ اُٹھی ہے

شرر بار انفاس کے قافلو ——
آج ڈھلنے تو دو
عزم ہمّت شکن کو
رباب اور بربط کے سانچے میں
ڈھلتے ہوئے
تیز
ظلمت کے رہوار کی باگ
مڑ جائے گی

یک نفس اور ٹھہرو ذرا ——
خواب گہ کو
تو ویران
مت چھوڑ جاؤ
مرے دل کے بیدار نغمو!
تمھیں اپنے
ذلّت کے سر کی قسم
اک ذرا سا توقّف

کہ یہ برگزیدہ
نظر منتظر ہے
ابھی تو اُس اک حرفِ آتش نفس کی
جو برسے گا دشمن پہ فولاد بن کر

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء

ہزاروں
مہ و سال چمکے
اُفق پر
تمدّن کے
لیکن یہ خلقت
ابھی تک
بہ ایں مرگ انبوہ
شبَ کے سیہ فام رہوار پر گامزن ہے

ہزاروں تو کیا ——؟

اے شقاوت کے دریا کی زہراب موجو!
ایک خورشید احمر اُفق پر
جو چمکے
تو پتھر پگھلنے لگیں
غم کے
یخ بستہ ساحل
لرزنے لگیں
موت جھانکے
حیات آفریں چلمنوں سے

کوئی وقت کا
گھومتا
سُرخ سیّارہ
ٹوٹے زمیں پر
تو پھر زندگی آب و رنگ و ہوا بن کے
رگ رگ سے
تشنہ دہن آبگینوں کے ٹپکے

اے شرق اور غرب کے رہنے والو
تمھارے نہنگ آشنا قہقہوں میں — جو سچ پوچھتے ہو،
تو سیلاب ہے خون کے آنسوؤں کا

شارعِ اُمّید

آج پھر طوفان اُٹھاؤ

بادلو ——

گرجو

کڑکتی بجلیو ——

ظلمت بدوش آفاق پر چمکو!

کفن اوڑھے ہوئے صدیوں کی تاریکی نے جیسے گھور کر دیکھا!!

یہ سنّاٹا —— یہ خاموشی

تمنّا گیر حسرت کی

مآلِ اندیشِ دریوزہ گری —
کھلتا ہوا در
بامِ زنداں کا

کوئی مدھم سی
ہلکی سی
کرن پھوٹی
وہ زندانِ تخیل کے دھندلکوں سے
عدم نا آشنا کرنو —
تمھاری زندگی اور موت کا ضامن
تمھارا عزم نامحکم

وہ لمحہ - - -
— جلوت و خلوت کے
ہنگامِ طرب سے دور —
افسردہ شکستہ

وقت کے کندھوں پہ وہ اُڑتی ہوئی
اک رات کی دوشیزۂ عنبر فشاں
زلفوں کو لہرائے ہوئے
گردوں کی بے پایاں گراں خوابی پہ
وحشت کا نزول بیکراں —
کھُلتا ہوا در بام زنداں کا

تمھارے بربطوں کی گونج سے
گھٹنے لگا دم
صبح کی شہزادیٔ گیتی کا
ملبوس حریر
اُڑنے لگا
— مدّھم سی ہلکی سی کرن

اور صبح کے ماتھے پہ افشاں کے سوا کچھ بھی نہ تھا

گُریز

زندگی ——

مشیّت کا کاروانِ مجاز

یا پھر —— گُریز تیری حقیقتوں کا ——!

کہ جیسے افسردہ شاہراہیں

تھکے تھکے بام و در

جواں رات کی برہنہ روانگی

دم قدم پہ بڑھتے ہوئے سفینے ——

جنون و حکمت کے

—— تنگ و تاریک سُرخ گلیاں

تری حقیقت
مری حقیقت سے کم نہیں ہے
مگر میں یہ سوچتا ہوں
شائد ــــ!
تری حقیقت
مری حقیقت پہ فتح پا جائے ــــ؟
سُرخ شعلے بڑھیں ہواؤں پہ
سرد لاشوں کی کپکپاہٹ سے
ایک گہری لکیر کھنچ جائے
اہرمن کی ــــ!!

بساط شطرنج پر وہ بڑھتے ہوئے پیادے
وہ شاہ و فرزیں کی
تیز گام،
آہنی
قدم در قدم قطار
ــــ انگبیں نگاہوں میں

جھلملاتی ہوئی سیہ رات
کروٹیں لے رہی ہو جیسے
مری حقیقت
تری حقیقت پہ فتح پا جائے گی

اُٹھو!

گرمِ رَو تنفّس کی آمد و شد سے
پھیر دو
زندگی کا رُخ
ابرِ نو اُٹھے
قمقمے نگاہوں کے رقص کرنے لگیں
بساطِ نظامِ کہنہ کا سنگِ بنیاد اُلٹ کے رہ جائے
شبنمی، صندلیں رداؤں سے
شب کی دُلہن چمک کے نکلے

کہ جیسے افسردہ شاہراہیں

تھکے تھکے بام و در
جواں رات کی برہنہ روانگی
دم قدم پہ بڑھتے ہوئے سفینے ——
جنون و حکمت کے
تنگ و تاریک سُرخ گلیاں

مداوا

وہ روایاتِ قدیم
اور وہ پارینہ حدیث
جن کے اوراقِ سیہ پوش پہ بنیادِ سحر رکھی گئی
دور اب مشرق و مغرب سے بہت دور
ترے خلد کے ویرانوں میں
کروٹیں لے بھی چکیں
شب کے سیہ خانوں میں
کپکپاتی ہوئی شمعوں کا لئے نورِ سحر

سیکڑوں گرد میں لپٹے ہوئے تابندہ نجوم
جھلملاتے ہیں مرے ذہن کے ایوانوں میں
سیکڑوں گونجوں میں لپٹی ہوئی آوازِ جرس
آج آتی ہے کہیں پھر سے مرے کانوں میں

ظلمتِ شب کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
یاد کی گرد سے اُٹھتے ہوئے ویرانوں میں
قہرِ آدم کا وہ اُٹھتا ہوا سیلابِ عظیم
موت کی نیند میں سوئے ہوئے افسانوں میں

اہرمن جاگ رہا ہے درِ زنداں کھولے
وقت کی گونج سے تھرّا اُٹھے قرنوں کے دئے

تابشِ دیدۂ انجم کا بھی یارا نہ رہا

گونج

تموّجِ بحرِ بیکراں کی
سپردگیٔ سحر کی خاطر
ہیں آج
زنداں کی چار دیواریوں سے
ٹکرا تو جاؤں —— لیکن
زمین کی وسعتوں سے لے کر
فلک کی تابندہ رہگزاروں تک
آہنی بربطوں پہ
ڈھلتی ہوئی
جہنّم کی سرخ چیخیں
نہ رُک سکیں گی

سیہ بگولوں کے
سرد جھونکوں سے
غم کے پرچم
نہ جھک سکیں گے

میں آج بھی
اپنی حسرتوں کی
شکستہ پا
رہ نوردیوں کے
سیہ کفن
باندھ کر جو نکلوں

تو قافلے نکبتوں،
نحوست کے کارواں،
بحرِ غم کے سیلاب
آنسوؤں میں
نہ بہہ سکیں گے

قدم قدم پر
رباب کی دھڑکنوں سے
اُٹھتا ہوا دھواں
شعلۂ سیہ پوش
بن کے
لہرا رہا ہے
جیسے
حیاتِ صبحِ ازل کا
تڑکا بھی
شام کے
بے پنہ اندھیرے میں
کھو چکا ہو
رباب کے
خونچکاں ستاروں سے
لے کے بربط کی
بھیرویں تک

یہ آج خود
میری اپنی عظمت کا
سنگ بنیاد
ہل گیا ہے

تمھاری رعنائیوں کی سوگند
آج بھی
غم نبرد و حرماں نصیب انساں
خود آگہی کے
فریب کی
سرحدوں سے
آگے نہ بڑھ سکا

شبنمی ستاروں کی
رفعتِ بیکراں سے لے کر
سپہرِ عرشِ بریں تک
آواز دے چکا ہوں

نیا سویرا

(۱)

عجم کی
شیرازہ بندیوں کے
یہ خونچکاں
بام و در —
نگہ کی
سحر —
فریبِ نشانِ منزل

(۲)

دیارِ مشرق —

ہم اپنے زنداں سے
آج نکلے ہیں
عظمتوں کا
وقار لے کر

چمکتی لہروں کے
خونچکاں
شعلۂ تپاں پر

سمندر اور آسماں کی
پہنائیوں سے
اُٹھتے ہوئے
درخشاں
نشاں
تمدّن کے ـــــ

احمریں،

آہنی صلیب
اور ہلالِ نو
--- اور ------
گزرتے قدموں کی،
بڑھتے قدموں کی
آہٹیں ——

وقت کے سلاسل کے
پیچ وخم میں
رواں دواں
قافلے سحر کے

(۳)

نہ جانے کتنے ہی
جگمگاتے
اُفق پہ
گھومی
تو ہے یہ دھرتی

مگر سحر کی
یہ لرزشِ بے دریغ —
افرنگ کے
سیہ فام آسماں سے
اُبھرتے سورج کی
تند و تیز آہنی شعائیں
— نوائے بے ربط
بن کے
مشرق کے
آسیا خانۂ قفس پر
چمک اُٹھیں تو
— ہزار ہا
گردشوں نے
دوراں کی
مڑ کے دیکھا

رواں دواں کروٹوں میں

گم ہو گئیں
وہ صدیاں بھی
جن کو تاریخ کی
قلم بند
بربریت بھی
پھر سے
دُہرا نہیں سکی ہے

(۴)
رباب کی
دھڑکنوں سے
اُٹھتا ہوا
وہ اک شورِ الاماں
جنّت و جہنّم کی
خواب گہ سے
جو ہو کے گزرا
تو خوف کی
بارگاہِ یزداں بھی

کانپ اُٹھی —

لرز اُٹھا
سرمدی ستاروں کا
پاسباں

گردشوں نے
دوراں کی
مُڑ کے دیکھا

سمندروں کا
جلالِ ہمّت شکن بھی
گُم ہو گیا
دُھندلکے میں
روشنی کے

(۵)

لہو میں ڈوبی ہوئی

ہزاروں
دمکتی پیشانیوں نے
خم کھا کے
دوشِ فردا کی
احمریں
رہگزر کو دیکھا

تمدّنِ نو کا
رہ نورد
آفتاب
ہر منزلِ حقیقت کی
خاک اُڑاتا

بہ عزمِ نو
جلوہ گر ہے
کندھوں پہ
اپنے
دیوار ہائے

خنداں اُٹھائے
زندانِ صبحِ گیتی کے
بام و در کی

(۶)

حیات کی
سرزنش کو نکلو ــــــ
ابد کے
زندہ لہو میں
ڈوبے ہوئے
مشیّت کے قافلو ــــــ

یم بہ یم
قدم در قدم

متاعِ عمل کا
بارِ گراں اُٹھائے

جمود کی

صبح رزم گہہ سے
—— گرجتی صدیو
شقاوتوں کی
برہنہ چھاتی پہ
چڑھ کے
دھرتی کی
سربلند
آہنی چٹانو ——
نفس کے
شعلوں کی
تیز لے پر
وہ گیت گاؤ
جو آج مشرق کی
وادیوں میں
ہزاروں
چلتی ہوئی

غضبناک
آندھیوں کو
جھُلس کے رکھ دے

ضیائے خندہ

شفق کے رنگ میں ڈوبی ہوئی جبینِ سحر
سکوتِ نیم شبی کا خمار پلکوں میں

روائتوں کی کمندوں کو توڑ کر نکلا
تو جام صبح کی عظمت کا بھی تو پی نہ سکا

اب آئے ہو مری محرومیوں کا ساز لئے
جبینِ خُم سے نکلتے ہوئے صنم خانو
سرور و کیف کی دنیا بدل گئی جیسے

ہجومِ تشنہ لبی کی ضیائے خندہ بھی
شعاعِ مہر کی تابندگی سے بجھ نہ سکی

خزاں نصیب قفس کو حیات مل جائے
تو ایک شب کی حقیقت کی آرزو اے دوست
جمالِ خُلد کی رعنائیوں سے کیا کم ہے؟

وہ ایک شب کہ جو زندہ ہے لوحِ آدم پہ
روائتِ غمِ رفتہ کا ساز و رنگ لئے
وہ ایک شب کہ جو شب زندہ دار پلکوں میں
غبارِ زیست کی تابندگی سے لپٹی ہے

عجم سے دور عرب کی نگہ کے زد سے پرے

نئی بلندی

اُٹھاؤ لنگر ــــ

دمِ رگِ ہر نفس سے نکلے صدائے شمشیر و ضربِ یزداں

پکارتی ہے نئی بلندی نئی چٹانوں کی سرحدوں سے

ٹھہر کے دم لے گی آج جیسے مری حقیقت

تری حقیقت تو اک گماں ہے

فشارِ قلبِ شرر فشاں کا

قدم قدم پر نگہ کے پیہم بدلتے آہنگ پر وہ اُٹھی حیات کی لے

ہزار ہا جنبشیں زمانے کی موج ساکت کی طرح خاموش ہو گئی ہیں،
تموّجِ بحرِ نو کی لرزش نوائے آتش فشاں کی موجوں سے کم نہیں ہے

حیات اُٹھّے گی اپنے سر پر لئے تمدّن کا سُرخ پرچم
بلندیوں کی نئی چٹانوں سے گونج اُٹھی

مری حقیقت کا ساز بجنے لگا فضاؤں کی وسعتوں میں

اشتباہ

یہ لکیریں ——— !
یہ لکیریں تو مٹ بھی سکتی ہیں
ان لکیروں سے یہ نہ کہنا

کہ زندگی کو حقیقتوں پہ گماں بھی ہوتا ہے

زندگی کو حقیقتوں پہ گماں بھی ہوتا ہے ——— ؟
یہ نہ کہنا

کہ آج مجھ کو اس اک حقیقت پہ بھی گماں ہے

خودی

یہ اہرمن کی خُلدگاہ
بے پناہ ظُلمتوں میں
رات کی سکوں نواز تربتیں
مرے خیال کی بُلندیاں
عجیب بات ہے
کہ جب خیال کی بلندیوں سے میں
نبرد آزما ہوا
حیات بن کے سامنے یہ کائنات آگئی

اندھیرے کا گُمان تو خود اپنی ذات پہ بھی ہے

تمام منزلوں سے ہو کے جب گزر چکا تو ـــــ میں
اِس اِک مقام پر خود آکے رُک گیا

یہ اک مقام آفتاب کی پہنچ سے دور ہے

غزلیں

۱

یہ بندشیں مری نظروں کا سیلِ امکاں ہیں
نگارِ گیسوئے فردا کا خم سمجھتا ہوں

مشیّتیں نہ ہوئیں تھیں کچھ اسقدر پامال
بلاکشانِ محبّت کا دم سمجھتا ہوں

تبسّمِ دلِ فردا کی ہر حقیقت کو
ایاغِ جلوتِ گیتی کا خم سمجھتا ہوں

اب آج بھی نہ ہوئی منزلِ حیات تمام
تو موت تیری حقیقت کو کم سمجھتا ہوں

۲

حیات تمکنتِ شوق کا ہے خمیازہ
کچھ اضطرابِ کم وکیفِ یک نظر تو نہیں

اب آسماں کی حقیقت تمام زنداں ہے
یہ اعتماد ــــ بیک جنبشِ نظر تو نہیں

خود آگہی کا فریب، اور تو ہے کیا، ورنہ
حقیقتوں کی حقیقت کچھ اسقدر تو نہیں

میں اپنی زیست کی تابندہ رہگزاروں میں
کچھ اسقدر غمِ رفتہ سے بیخبر تو نہیں

یہ زندگی کہ جسے آنسوؤں نے چمکایا
تری نگہ کے تبسّم کا اک شرر تو نہیں

یہ منزلیں تو بہر گام منزلیں ہیں شہیرؔ
کچھ انقلابِ زمانہ سے بے خبر تو نہیں

۳

جب زمیں آسماں سپر ہوگی
عالم آرائی دگر ہوگی

سر بہ مہر آبگینۂ خنداں
جگمگاتی ہوئی نظر ہوگی

کون اٹھا ہے میکدہ بردوش
تیری بھکی ہوئی نظر ہوگی

رنگ چڑھنے دے آبگینوں میں
یہ نگہ آفتاب پر ہوگی

جاگ اُٹھو سحر کے سیّارو
مضطرب روح نغمہ گر ہو گی

قلب یزداں تپاں تپاں اے دوست
بے بسی کیا کچھ اسقدر ہو گی

رفعتیں جاگ جاگ اُٹھیں گی
جب زمیں آسماں سپر ہو گی

۴

ہم نہ کہتے تھے کل سحر ہوگی
جگمگاتی ہوئی نظر ہوگی

دیکھ افسردہ گام منزل بھی
کتنی صدیوں کی رہگزر ہوگی

یوں بھی تو اے شہیرِ خستہ حال
تم نہ بولے تو آنکھ تر ہوگی

۵

جب ان آنکھوں کی بات ہوتی ہے
رقص میں کائنات ہوتی ہے

میری پلکیں پھر آج پُر نم ہیں
سَر بَرہنہ حیات ہوتی ہے

موت تو کیا حیات بھی چُپ ہے
چند لمحوں کی بات ہوتی ہے

زندگی زندگی نہیں ہوتی
موت کی کیا بساط ہوتی ہے

رفعتِ زیست کی بڑی قوّت
درد مندوں کے ہات ہوتی ہے

رفعتِ پرتوِ حقیقت ہے
خواب کی بات بات ہوتی ہے

جام چھلکا چکوُ بھی نادانو!
اب مرے دل کی بات ہوتی ہے

۶

سمجھ رہے ہو مگر داستانِ اہرمن
ارے یہی تو مشیّت کے دل کی ہے دھڑکن

وہ ذکرِ یار ہو یا مہر و ماہ کی دھڑکن
فسردہ کر ہی گئے کچھ فسانہ ہائے کہن

شگفتگیٔ گُل و لالۂ سحر معلوم
کِھلا نہیں ابھی غم ہائے جاوداں کا چمن

چھُپا چھُپا بھی گئی وارداتِ قلب و نظر
فسانہ کہہ بھی گئی چشمِ نرگسِ پُرفن

گزر رہا ہے دو راہے سے کاروانِ حیات
سپہرِ وقت کے ماتھے پہ پڑ رہی ہے شکن

فریب دے نہ سکے خود کو اے غمِ ایام
ہزار گردشِ دوراں، ہزار دار و رسن

۷

موت نے زیست کی سرحد پہ قدم رکھا ہے
دور تک اب کہیں صدیوں کا گماں تک بھی نہیں

رفعتِ کون و مکاں انجمِ رخشندہ نگار
یوں تو کہنے کو تحیّر کو گماں تک بھی نہیں

آبدیدہ سرِ منزل نہ ہوئے تھے ہم یوں
سر برہنہ تری قسمت تو یہاں تک بھی نہیں

۸

ربابِ زیست تمدّن کا سازِ بیداری
نوائے شوق بہ عنوانِ ضربتِ کاری

حیات و موت کی مردہ حقیقتیں مت پوچھ
کفن لپیٹ کے نکلی ہے صبحِ زنگاری

ابھی تو صبحِ حقیقت تمام زنداں ہے
شہیدؔ رات کی پلکیں ہنوز ہیں بھاری

۹

آج پھر صبحِ غزل خواں اشکبار آنکھوں میں ہے
سر برہنہ جلوتِ پروردگار آنکھوں میں ہے

دیدۂ عبرت طرازئ بہار آنکھوں میں ہے
جگمگاتی شاہراہوں کا غبار آنکھوں میں ہے

کپکپاتے وقت کے دل کا غبار آنکھوں میں ہے
صبح گاہِ نو دمیدہ شرمسار آنکھوں میں ہے

آج پھر صدیوں کی دھڑکن سوگوار آنکھوں میں ہے
دل کی ہر لرزش پہ شمعوں کی قطار آنکھوں میں ہے

رات تیری کہکشاں گیر آبگینوں میں ہے بند
صبحِ مشرق کے تحکّم کا فشار آنکھوں میں ہے

رفعتِ گیتی کی ہر لرزش پہ صدیوں کی پکار
کانپتے لمحوں کی شمعِ زرنگار آنکھوں میں ہے

عظمتِ جولانگہِ طوفانِ آدم کی قسم
کوکبِ گیتی کا رنگیں شاہکار آنکھوں میں ہے

رُخ پہ گیتی کے دھڑکتی شاہراہوں کا نزول
جام بر کف جلوتِ پروردگار آنکھوں میں ہے

برہمیٔ دیدۂ خونابہ بار اے دل نہ پوچھ
کتنے شب زندہ ستاروں کا مزار آنکھوں میں ہے

جل بجھی اک شمعِ بے رنگ اور اگر اے دِل تو کیا
ضربتِ فولادِ آدم صد ہزار آنکھوں میں ہے

جامِ جم چھلکا کے بھی صبر آزما صورت نہ ہو
موجِ یم بر ہم بہ ظرفِ کردگار آنکھوں میں ہے

رفعتِ گیتی کی موجِ بے محابا پر نہ جا
دم قدم پر زندگی نو بکار آنکھوں میں ہے

موت تو کیا خود حیاتِ جاوداں ممکن نہیں
رات کی چھاتی پہ گردوں کا وقار آنکھوں میں ہے

شاعرِ مشرق تری زندہ نوائی کی قسم
آج صدیوں کے مقدر کا غبار آنکھوں میں ہے

۱۰

برہمیٔ دیدۂ ہجراں نما سمجھا تھا میں
گردشِ سازِ حیاتِ نو تو کیا سمجھا تھا میں

رقص میں صبحِ نوا انگیز کا ہر زیر و بم
منزلوں کی ہر مشیّت کو خدا سمجھا تھا میں

جگمگاتی شاہراہوں پر تحیّر کا غبار
ایک گُم گشتہ حقیقت ــــ وہ بھی کیا سمجھا تھا میں

تابناکیٔ فشارِ دیدۂ انجم بھی کیا
ہر نفس سازِ حیاتِ رقصِ پا سمجھا تھا میں

آفتابِ نو بہ صد رنگِ غبارِ کہکشاں
مُسکراتے آبگینوں کی صدا سمجھا تھا میں

۱۱

تھکا تھکا سا یہ افسردہ گام محور ہے
جمود کی وہی اک صبح و شام ہے کہ جو تھی

وہی سکوت کا اِک عالمِ نزع ساقی
وہی صدا دمِ مرگِ دوام ہے کہ جو تھی

وہی نوائے فسردہ، وہی شکستہ لبی
وہی جراحتِ رفتہ تمام ہے کہ جو تھی

شہیرِ عرصۂ گیتی سے تا بہ عرش بریں
بجھی بجھی سی اک افسردہ شام ہے کہ جو تھی

۱۲

کروٹیں لے رہی ہے ہر لرزش
گردشوں کو سکون ملتا ہے

آبگینوں میں صبحِ خنداں کے
میری پلکوں کا خون ملتا ہے

رفعتِ صد حیات ہے، اے دل
پھر بھی زنداں کا خون ملتا ہے

جب بھی دیکھو حیات زندہ ہے
آرزوؤں کا خون ملتا ہے

۱۳

دلِ بیتاب کی دھڑکن پہ صدیوں کے قدم نکلے
ایاغِ زیست کا پرچم لئے سُہراب و جم نکلے

کچھ اِس درجہ ہراساں دوریٔ منزل سے ہم نکلے
بہت دَرد آشنا ہونے پہ بھی بیتاب کم نکلے

اَب آئی ہے مری منزل بھی کیا کچھ ختم ہونے کو
نوائے دیدۂ ہجراں نما کے پیچ و خم نکلے

۱۴

ستّاروں پر ہم نکلے　　کوکب نکلے، جم نکلے
آبادی سے ہو کر گزرے　　کتنے غمگیں ہم نکلے
طوفانوں کی زد سے ہو کر　　رخشندہ پرچم نکلے
دھرتی کی چھاتی پر چل کر　　کتنے تازہ دم نکلے
آپ بہت برگشتہ خاطر　　ہو کر بھی کچھ کم نکلے
آج حیات بھی کچھ گُم سُم ہے　　کس نگری سے ہم نکلے
جاگ اُٹھو اب اے سیّارو　　میخانوں سے جم نکلے
اپنے خیر تو کیا کچھ ہوتے　　غیر بھی کیا کچھ کم نکلے
خوب سمجھ رکھّا تھا جن کو
سُہراب و رُستم نکلے

۱۵

سازِ نوائے زندگی؟ بانگِ درائے زندگی
طوفانِ سیلِ بیکراں موجِ ہوائے زندگی
زندہ لہو میں ڈوب کر نکلے تو آئے زندگی
اب بھی جو لب آزاد ہیں دھوکا نہ کھائے زندگی
کِس کِس حقیقت کا گماں نظروں پہ لائے زندگی
محور پہ ہم رقصِ آسماں
دھرتی پہ گائے زندگی

۱۶

وسعتِ بے کراں کے حاصل کا
بحر خمیازہ کش ہے ساحل کا

وہ رُخِ کائنات پر چمکا
یہ جو اک آفتاب تھا دِل کا

میں گذر جاؤں بھی تو کیا ہو گا؟
مرحلہ طے جنوں کی منزل کا

۱۷

یُوں تو کہنے کو تحیّر کا فسُوں خام بھی ہے
بادۂ سُرخ سے لبریز یہ اک جام بھی ہے

آج شاید تری پلکوں کی گھنی چھاؤں میں
میری نظروں کا چھلکتا ہوا اک جام بھی ہے

ہم نفس ساز کی دھڑکن پہ نہیں ہے موقوف
میرا ہر نقشِ قدم مُفت میں بدنام بھی ہے

ہر تغیّر تو نہیں صبحِ طرب کا پیغام
رات کندھوں پہ اُٹھائے ہوئے احرام بھی ہے

خوفِ ناکامی و رُسوائی کو سینے سے لگائے
گونج اُٹھنے کو تمدّن کا در و بام بھی ہے

کون اُٹھا ہے سرا پردۂ گیتی سے شہیر
رقص کرتا ہوا گردونِ طرب گام بھی ہے

۱۸

سحر بہ جلوتِ آمد سحر نہیں — لیکن
یہ رہگزر جو کہیں تیری رہگزر ہوتی

ربابِ زیست کے تاروں کو چھیڑ لیتا میں
کرم نمائیِ سازِ نظر اگر ہوتی

کچھ اسقدر تو نہیں آنسوؤں سے بیگانہ
چراغِ دیدۂ انجم کی رہ گزر ہوتی

۱۹

سینۂ دہر سے اب حسرتِ پیکار اُٹھا
زندگی ـــــ خون میں ڈوبی ہوئی تلوار اُٹھا

گردشِ صبح نوا ہائے فلک بار اُٹھا
اور ہمّت ہے تو سازِ دمِ گفتار اُٹھا

یہ ستم ظرفیٔ اربابِ سیاست ہی تو ہے
ہم نفس آج جو یوں بزم سے بیزار اُٹھا

برق کے گریۂ پیہم پہ نہیں ہے موقوف
ہم نفس ساز کی دھڑکن سے جو پیکار اُٹھا

۲۰

رُسوا سرِ بازار جو ہونا ہے تو ہو لے
بڑھ کر مگر اے دوست کوئی بات تو بولے

جنّت مری اک طرفہ تماشا تو نہیں ہے
اے دوست محبّت کی یہ اک بات تو ہو لے

فردا کی دھڑکتی ہوئی چھاتی سے وہ اُٹھّے
جلتے ہوئے بربط پہ دہکتے ہوئے شُعلے

موت آج تری زیست کی دھڑکن پہ گماں ہے
ہم بھی تو ہیں زنداں کی حقیقت کو ٹٹولے

بندِ غمِ امروز کے زنداں سے نکل کر
آفاق کی ہر رفعتِ پایاب کو چھو لے

فردا کی یہ اک گردشِ پیہم نہ رُکے گی
بدلے تری زلفِ شکن آرا نے ہیولے

۲۱

یہ دوش کی ظلمت ہے وہ فردا کے دھندلکے
آ زندگی و موت کی سرحد سے نکل کے

رفتار کی جنبش تو نہ بھاگے گی نکل کے
خواب آج جو دیکھے ہیں وہ افسانے ہیں کل کے

دوزخ کو تری روند کے، جنّت کو کچل کے
آیا ہوں دہکتے ہوئے انگاروں پہ چل کے

کون آج صراحی کو اٹھاتا ہے اجل کی
ہم رقص ہے دوشیزۂ شب خُم سے نکل کے

صبحیں مرے نغموں کے تنفّس سے بھری ہیں
ظلمت کی یہ چادر بھی تو رُخ سے ترے ڈھلکے

آتا ہوں مٹاتا ہوا ہر جبرِ کہن کو
پلکوں میں لئے صبح کی عظمت کے دُھندلکے

گردوں کو بھی دے گا ترے پیغامِ تباہی
دھرتی کا تنفّس مرے نغموں سے نکل کے

مت پوچھو اب اے دوستو کیا حال ہے کب سے
بیٹھا ہوں دوراہے پہ حیات اور اجل کے

کچھ زیست کی عظمت لئے کچھ خواب اجل کے
کچھ سہمے ہوئے نقش ترے رنگ محل کے

نکلے ہیں سرِ راہگذر بھیس بدل کے
کچھ آج کے ظلمت کدے کچھ کل کے دُھندلکے

میں بھی ہوں رواں منزلِ مقصود کی جانب
روشن کئے دو پھول نگاہوں میں کنول کے

۲۲

جس کی خود آگہی پہ گماں کو بھی ہے یقیں
کیا آپ اپنے آپ کو پہچانتے نہیں

صاحب نظر تو میں بھی ہوں لیکن کچھ ایسی بات
کہتا ہوں سب کے سامنے —— تجکو یقیں نہیں

صبحِ غمِ حیات ہے، صبحِ غمِ حیات
موجوں کے اضطراب میں کوئی کمی نہیں

میں ابتدائے صبحِ ازل سے ہوں ہرزہ کوش
کیا میری بات کا تمھیں بالکل یقیں نہیں

آغازِ داستاں تو نہیں ہے مآلِ کار
انجام پہ فضول زمانہ ہے نکتہ چیں

ملتا بھی ہے شہیرؔ کہیں زیست کا نشاں
اس زندگی پہ بھی نہیں آتا تجھے یقیں،

۲۳

آج یہ اِک غم بھی تو ہے بیکراں
مجھ کو تری یاد بھی آئی کہاں

موت کے جبڑے سے وہ اُٹھّا دھواں
زندگی دیتی ہے تجھے لوریاں

ق

صبح کے شعلوں کے تبسّم کا نور
برق کے باراں کے نفس کی فغاں

چھیڑ کے مضرابِ دلِ ارمغان
آج سُناتا ہے کوئی داستاں

سینۂ انجم سے چمک سی اُٹھی
ساز کے شعلوں سے وہ اُٹھا دُھواں

۲۴

تو نے ابھی دیکھا کہاں ؟
اُٹھتے ہوئے دل سے دھواں

ہوتا ہے کچھ دل کو گماں
تجھ پہ یقیں تھا بھی کہاں

کچھ اِس قدر مایوس ہوں
ہوتا ہے ہر شے پر گماں

وہ میرے دل کی بات تھی
یہ تیرے دل کی داستاں

۲۵

آفتابوں کی چمک تاروں میں ہے
روشنی زنداں کے انگاروں میں ہے

جل بجھی گو شمعِ بزمِ کائنات
روشنی خاموش سیّاروں میں ہے

پی کے اِسدرجہ بھی چپ رہتے ہیں کیا؟
ظرف یہ کچھ تیرے میخواروں میں ہے

موت بھی کترائے جس سے وہ حیات
میرے زخمِ دل کے انگاروں میں ہے

۲۶

ہاں اُٹھا دیتا نہیں کیوں یہ حجاب
دوش کے چہرے سے فردا کا نقاب

زندگی ہے زندگی کا یہ حجاب
وہ اجل نے رُخ سے سرکایا نقاب

کچھ عیاں اسدرجہ تو مجھ پر نہ تھا
جسقدر تیری نگہ کو تھا حجاب

زندگی دیتی ہے اِذنِ اِجتہاد
موت دیتی ہے تجھے اِسکا جواب

تیرے دل پر بارِ خاطر تو نہیں
میرے دل کا بے محابا اِضطراب
تیرے دستِ شوق کی حاجت نہیں
میں اُٹھا لیتا ہوں خود بڑھ کر رباب

۲۷

جمود کی بھی حقیقت کو زد میں لائے ہوئے
شکست کھائے ہوئے، ہونٹ مسکرائے ہوئے

ہم آرہے ہیں غمِ زیست مسکرائے ہوئے
تری نگاہ کے روشن کنول جلائے ہوئے

رکا رکا سا ہے کچھ دورِ گردشِ ایام
چراغ بزمِ شبستاں کے جھلملائے ہوئے

جہاں سے اہلِ زمانہ ہوئے بہت محتاط
اگرچہ ہم بھی اٹھے بات کو بنائے ہوئے

ہم اپنے آپ کو سمجھے بھی تو کہاں اے دوست
تری نگاہ کی ہلکی سی چوٹ کھائے ہوئے

سکونِ قلب کی باتیں تو خیر ممکن ہیں
مئے نشاط سے دامن مگر بچائے ہوئے

خود اپنے آپ پہ تجھ کو یقیں نہیں اے دل
ارے فریب تو ایسا نہیں ہے کھائے ہوئے

حیاتِ بے خبری کے بھی ہوش اُڑ جائیں
اجل بھی سامنے آئے تو مسکرائے ہوئے

فنا کے بعد بقا کا مقام کیا ہوگا
دیئے زمان و مکاں کے ہیں جھلملائے ہوئے

۲۸

یہ کیا ہوا کہ غمِ روزگار کے با وصف
نگاہِ ناز تغافل سے تیرے فرصت پائے

نثار اِک تری اس طرزِ خوش خرامی کے
وہ ہم ہی تھے کہ جو اس رہگزر میں منہ کی کھائے

کبھی جو ترے نگاہِ کرم کی یاد آئی
بڑے خلوص سے اہلِ وفا تھے سر کو جھکائے

یہ کیا ضرور کہ ہر شب نہ ہجر میں کاٹیں
مگر کتابِ دلِ مُعتبر کا دھوکا کھائے

یہ آج ہم بھی غمِ بے خودئ ہجرِ یار
کسیقدر تو جہاں کے بھی غم کو ہیں بہلائے

کسی سے مل کے بچھڑنے کی ہائے وہ ساعت
یہ انقلاب مری زندگی میں بھی آئے

شکست موت کو دے کر حیاتِ محکم سے
بلندیوں سے اُٹھے پستیوں کی زد میں آئے

گزر گیا ہوں زمان و مکاں کی سرحد سے
ہزار منزلِ راہِ وفا میں دھوکا کھائے

متفرق

بے بسی میرے خداوند کی بھی تھی ورنہ
آج کہنے کو تو میں بھی کوئی ناشاد نہیں

دامن میں سمیٹے ہوئے صدیوں کی سیاہی
آ اے غم دوراں تجھے سینے سے لگا لوں
مشرق کے اُفق پر بھی تو چمکا ہے ستارہ
میں بھی پئے تعظیم جبیں اپنی جھکا لوں

تمھاری پلکوں کے آبگینوں میں ظلمت افشاں سحر کی دھڑکن
تجلئ نو کے ہمرکاب احمریں ستاروں کی رہگزر ہے

شبہ مجھ کو بھی آج ہوتا ہے
تیرا یوں تو ہے اعتبار بہت

میں تیری نگاہوں کی حقیقت سے ہوں واقف
جام مئے اُلفت بھی ہر رکھتی ہیہ ستم کوش

اے شبِ ہجر ضبط کیا کرتے
خون اشکوں کا جب گوارا تھا

پھر رنگ آبگینے بھی تو چمکے
قفس کی گرمیٔ سوزِ نہاں سے

دما دم آج کوئی زندگی کے محور پر
ہے محو رقص — کہیں جیسے موت چونکی ہو
یقین اسدرجہ کچھ مُحکم نہیں ہے
یہ اک تیری نگہ کو بھی گماں ہے

ناگہاں بندِ غمِ امروز سے نکلی حیات
اور زمیں کے ساز پر گانے لگی کل کائنات

دَور ماضی کا ہو یا گردشِ فردا کا ایاغ
داغ ہیں سینۂ گیتی پہ مری عظمت کے

قہقہوں میں کہیں نہ گُم ہو جائے
یہ جو اشکوں کی ایک صورت ہے

ابھی تک پائے جاتے ہیں نقوشِ رازِ سربستہ
مری خاکسترِ پنہاں میں انوارِ سحر دیکھو

ربابِ زیست کے تاروں کو چھیڑ لیتا ہوں
مگر کہیں سے تمھاری صدا نہیں آتی

ہزار بار تری بے رخی کو بھی سمجھا
مگر وہ ایک تبسم کہ جس پہ پیار آئے

بہت دردآشنا ہوتے ہوئے بھی
میں اپنے آپ سے ناآشنا ہوں

اگر حیات کی دھڑکن بھی سازگار نہ ہو
تو موت پہ کسی صورت سے اعتبار نہ ہو

عرصۂ گیتی پہ نجمِ لالہ فام آہی گیا
منزلِ بامِ فلک پر اک مقام آہی گیا

تیری منزل کہہ رہی ہے تو بہت مجبور ہے
یہ تری رجعت پسندی مجھ سے کوسوں دور ہے

موت جب بے نقاب ہوتی ہے
زندگی کی کتاب ہوتی ہے

یہ ساز آج یونہی بے صدا رہیں گے کیا؟
کہاں گئی تری اے دوست حوصلہ شکنی

لبالب زندگی کے آبگینے
اب اتنا بھی تو کیا شورِ غمِ دل

ربابِ زیست کی دھڑکن نوائے تشنہ لبی
چراغ جل بھی نہ پائیں تو کیا ہے دل کی لگی

کیا کیا جنبشِ مژگاں نے اثر آج کی رات
دے اٹھا تو خطِ پیمانہ مگر آج کی رات

قطعات

جگمگاتا ہوا یہ رُوپ، یہ رنگ اور نکھار
یہ بہکتے ہوئے گیسو، یہ دہکتے رخسار
یہ تخیّل کے چھلکتے ہوئے ساغر جیسے
خم میں ڈوبی ہوئی پلکوں کی نہفتہ گفتار

یہ خم و پیچ، یہ بل، یہ لب و دنداں، یہ جمال
صحبتِ شب کے اندھیرے میں ثریّا سے وصال
لغزشیں یوں تو بہت سی ہوئیں، اے جانِ بہار
آج کی شب ہے وہ شب جس کی نہیں کوئی مثال

خام نکلے مرے نغموں کے پراگندہ نقوش
خاک ہو کر بھی تو اُٹھا نہ مرے دل سے دھواں
کہکشاں شب کے دھندلکوں میں چھپی جاتی ہے
یادِ ایامِ عدم بھی ہے فقط ایک گماں

لہرائے ہوئے گیسوئے پُرخم کی قسم
بل کھائے ہوئے دردِ مجسّم کی قسم
جینا ترا جینا بھی تو اب کیا ہوگا
چھلکائے ہوئے دیدۂ پُرنم کی قسم

اے زیست تری رام کہانی سُن لی
کس طرح کٹی آہ جوانی سُن لی
آکاش کے جلتے ہوئے تاروں کی قسم
احساس کے شدّت کی رَوانی سُن لی